R. No. 2188/57

Regd. No. L. 7??

انجمن ترقی اردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

ٹیلی فون ۲۹

جلد ۲۴۔ شمارہ ۲۸ | ایڈیٹر:۔ آل احمد سرور | ۲۲ جولائی ۱۹۶۵ء

اداریہ

انگریزی اور ہندی کے اخباروں کو

اردو کا کیس بتائیے

۱۲ جولائی کے نیشنل ہیرالڈ میں ہندی اور اردو کے متعلق ایک اداریہ نکلا ہے۔ یہ اداریہ اس بحث کے خاتمہ کو ظاہر کرتا ہے جو کچھ عرصے سے ہیرالڈ کے کالموں میں جاری تھی اور جس میں ہندی کے مشہور ادیب یش پال اور اردو کے کچھ حامیوں نے حصہ لیا تھا۔ ہیرالڈ کو جواہر لال نہرو نے جاری کیا تھا۔ یہ اخبار اپنے مشہور ایڈیٹر چیلاپتی راؤ کی حق گوئی و بے باکی کی وجہ سے مشہور ہے۔ یہ جمہوریت اور سیکولرزم کا علم بردار اور قومی یک جہتی کا پُرجوش حامی ہے۔ اس نے بارہا اردو کے ساتھ انصاف کی بھی آواز بلند کی ہے، لیکن اس کے اس کیا اداریہ پڑھ کر ہمیں تعجب ہوا کیونکہ اس بار صرف ان خطوں کی بنا پر جو اس کے کالموں میں شائع ہوئے تھے، چند ایسے خیالات ظاہر کیے گئے ہیں جو ہمارے نزدیک انصاف پر مبنی نہیں۔ ہیرالڈ کے ایڈیٹر کو بحث کے درمیان فرقہ وریت کی جھلک بھی دکھائی دی لیکن اس نے یہ واضح کرنا ضروری نہیں سمجھا کہ کس فریق کی طرف سے اس کا اظہار ہوا۔ بظاہر اس نے دونوں کو اس کا مجرم پایا۔ ایڈیٹر نے اس پر افسوس ظاہر کیا کہ کسی فریق نے دونوں زبانوں کو ملانے پر زور نہیں دیا۔ ہندی کے حامی تو اس لیے دونوں کو ملانے کی بات نہیں کرتے کہ ان کے نزدیک یا تو اردو کوئی علیحدہ زبان نہیں یا اس کا وہ حصہ جو اسے انفرادیت عطا کرتا ہے اس قابل ہے کہ اسے کاٹ کر پھینک دیا جائے۔ اردو کے حامی دونوں زبانوں کے قریب آنے کے مخالف نہیں مگر وہ اس انضمام کو گوارا نہیں کر سکتے جس میں اس کا وجود ہی سرے سے غائب ہو جائے یا نظر انداز کر دیا جائے یا ناقابل التفات ہو۔ ہیرالڈ کے ایڈیٹر نے اردو کے کچھ نیک نیت مگر نادان دوستوں کی رائے کی بنا پر یہ نتیجہ نکالا ہے کہ فرق صرف رسم خط کا ہے اور اردو کے حامی بلاوجہ اردو رسم خط کو باقی رکھنا چاہتے ہیں اور اس کو سرکاری طور پر منوانا چاہتے ہیں جب کہ دیوناگری زیادہ سائنٹفک ہے۔ اس سلسلے میں ہمیں یہ عرض کرنا ہے کہ ہندی کے حامیوں کی طرف سے کوئی سنجیدہ، باقاعدہ اور زور دار کوشش اس بات کی نہیں ہوئی ہے کہ ابتدائی اور ثانوی منزل پر اور اعلیٰ تعلیم کی منزل پر بھی اردو کے شاہکار بھی ہندی کے نصاب میں شامل کیے جائیں۔ اگر ایسا ہوتا تو کم سے کم یہ تو کہا جا سکتا کہ ہندی کے حامی واقعی اردو اور ہندی کو ایک زبان سمجھتے ہیں اور اس کے ہر رنگ، ہر اسلوب اور ہر طرز کو اپنانے کے لیے تیار ہیں۔ لیکن ایسی کسی کوشش کی عدم موجودگی میں یش پال اور امرت لال ناگر جیسے حضرات کا یہ کہنا کہ اردو اور ہندی ایک زبانیں ہیں گو خالص لسانیاتی اعتبار سے کتنا ہی سچ معلوم ہوتا ہے اصل پورے سچ کو بیان نہیں کرتا اور دنیا جانتی ہے کہ آدھا سچ بعض اوقات بڑا خطرناک ہوتا ہے۔ ہم بارہا کہہ چکے ہیں اور پھر کہتے ہیں کہ اردو اور ہندی ایک ہی جڑ سے نکلی ہیں اور خالص لسانیاتی اعتبار سے ایک زبان کہی جا سکتی ہیں، مگر ان کا ارتقا جس طرح

اس شمارے میں

ہوا ہے اور اب جو ان کی حالت ہے اس میں ان کو دو زبانیں کہنا ہی پڑے گا۔ ہاں دونوں کو قریب لانے کی ہر کوشش مفید ہوگی اور ہمیں اس کی حمایت کرنی چاہیے اسی لیے ہم برابر یہی کہتے آئے ہیں کہ اردو کے سرمائے سے پورا کام لینے کے لیے، خود ہندی کے آئندہ روپ کی بہتری کے لیے اس علاقے کے تمام افراد کے لیے تسکین اور تکمیل کا سامان مہیا کرنے کے لیے اردو کی ترقی کے لیے ہر ممکن سہولت دینی چاہیے اور چلن کی بنیاد پر آئندہ کی زبان کا فیصلہ ہونا چاہیے۔ جس زبان میں جان ہوگی جو عوام کی اور جدید دور کی ضرورت کا ساتھ دے سکے گی، وہی اختیار کرلی جائے گی۔ مگر اس کے واسطے یہ ضروری ہے کہ دونوں زبانوں کو مقابلے کا پورا موقع ملے۔ یہ نہ ہو کہ ایک کے ہاتھ پاؤں باندھ دیے جائیں اور دوسرے کو ہر قسم کی چھوٹ دی جائے اور پھر کہا جائے کہ ایک زبان زیادہ مقبول ہے۔

رسم خط کے سلسلے میں ایک نکتہ فراموش کر دیا جاتا ہے اور وہ جذبات اور سہولت کا ہے۔ زبان کے مسئلے کو جذبات سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا اور نہ سہولت سے۔ اقلیتوں کے رسم خط کی حفاظت کی ضمانت تو دستور میں بھی ہے مگر یہ ضمانت اس وقت تک رہتی ہے جب تک سرکاری طور پر اس کی بقا کا انتظام نہ ہو۔ اردو کو ناگری رسم خط میں بھی لکھا جا سکتا ہے رومن رسم خط میں بھی اور اردو رسم خط میں بھی، اسے خواہ مخواہ فارسی یا عربی رسم خط کہنے سے اسے بدیسی ظاہر کرنا مقصود ہوتا ہے، پھر رسم خط یا زبان کے سلسلے میں اکثریت کے مشورے کی کوئی اہمیت نہیں۔ یہ خالص اس لسانی اقلیت کا معاملہ ہے۔ ہاں جمہوری حکومت کا یہ فرض ضرور ہے کہ وہ اقلیت کے رسم خط کی نہ صرف حفاظت کرے بلکہ اس کی ترقی کے لیے اسباب بھی فراہم کرے۔ اردو کے سلسلے میں آج کل بہت سے ناصح مشفق پیدا ہو گئے ہیں۔ کوئی اردو کو ہندی کہہ کر اس کی حیثیت کو ختم کرنا چاہتا ہے۔ کوئی اس کے لیے ناگری رسم خط اختیار کرنے کا مشورہ دیتا ہے۔ ہمارا فرض یہ ہے کہ ہم زبان اور رسم خط کے متعلق اپنا کیس مدلل طور پر اور قومی نقطۂ نظر سے انگریزی اور ہندی کے اخباروں میں پیش کریں۔ اب تک ہم اردو اخباروں میں اپنی بات کہنے پر قانع رہے ہیں، مگر ہمیں دوسروں کو اپنی بات سمجھانا بھی ہے ہمارا کیس کمزور نہیں ہے صرف ہندی، انگریزی اور دوسری زبانوں کے ذریعے سے اسے مناسب طور سے پیش کرنے کی ضرورت ہے۔

سیر بین

جب سے ہم نے ایک اخبار میں پڑھا ہے کہ ایک آدمی نے ایک چیتے کی ناک کاٹ لی اور چیتا ایسا بدحواس ہوا کہ فوراً دم دبا کر بھاگ گیا، اس وقت سے ہمیں چیتوں سے ہمدردی پیدا ہو گئی ہے۔ جیسے صاحب لنگڑے چیتے، آدم خور چیتے، سفید چیتے تو سنے تھے اب ایک قسم نکٹے چیتوں کی بھی پیدا ہو گئی ہے۔ خدا جانے ان چیتوں کے ساتھ ان کی برادری نے کیا سلوک کیا ہوگا۔ نکٹے آدمیوں کے ساتھ تو آدمیوں کا سلوک اچھا نہیں ہوتا اور نکٹی عورتیں تو بالکل چڑیلیں سمجھی جاتی ہیں۔

اس پر یاد آیا کہ انگریزی لفظ (TIGER) کا ترجمہ چیتا بھی کیا جاتا ہے اور شیر بھی۔ ایم کرشنن نے جو اخبار اسٹیٹس مین کے ماہر حیوانات و جنگلات ہیں لکھا ہے TIGER کا ترجمہ شیر ہونا چاہیے اور LION کا ترجمہ باگھ۔ چیتا ایک قسم کا تیندوا ہے جو بالکل دوسری برادری سے تعلق رکھتا ہے لیکن غالباً اس معاملے میں غلط العام فصیح کی مثل صادق آتی ہے۔

چیتے کی پتلی کمر سے ہمارے شعرا نے فائدہ اٹھایا ہے لیکن اقبال نے چیتے سے کچھ اور بھی کام لیا ہے۔ بال جبریل میں ایک شعر ہے ؎

چیتے کا جگر چاہیے، شاہیں کا تجسس
جی سکتے ہیں بے روشنی دانش و فرہنگ

کیا اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ اقبال کو خوں خوار جانوروں سے اس حد تک دلچسپی تھی کہ دانش و فرہنگ اس کے مقابلے میں انھیں ہیچ نظر آتے تھے۔

اقبال کے یہاں عقاب اور چیونٹی کا ایک موازنہ بھی دلچسپ ہے۔ عقاب چیونٹی کو طعنہ دیتا ہے ؎

تو رزق اپنا ڈھونڈتی ہے خاک راہ میں
میں نہ سپہر کو نہیں لاتا نگاہ میں

حالانکہ خاک راہ میں رزق ڈھونڈنے والی چیونٹی بھی بالآخر اس قابل ہوتی ہے کہ وہ زمین کے گرد چکر لگاتی ہے فضا میں قلابازیاں کھاتی ہے۔ چاند پر قدم رکھنے والی ہے اور زہرہ اور مریخ کی دنیا کی تاک میں ہے۔

عبدالقوی دسنوی

بنام اختر شیرانی

اختر شیرانی کے رسائل "انتخاب" اور "بہارستان" دیکھ رہا تھا کہ کچھ مشاہیر کے خطوط بنام اختر شیرانی نظر سے گزرے جن میں مولوی عبدالحق، سید مہدی حسن احسن لکھنوی، مرزا یاس یگانہ لکھنوی اور ضیاء الملک ماہر موزی قابل ذکر ہیں، یہ خطوط دلچسپ اور معلومات افزا ہیں اور ساتھ ساتھ اختر شیرانی کی کامیابیوں کا اعتراف بھی ہیں۔ امید ہے کہ قارئین کے لیے دلچسپی کا باعث ہوں گے۔

(۱)

مکتوب عبدالحق

ہاپوڑ ضلع میرٹھ

۱۴ فروری ۱۹۲۶ء

عزیزی سلمہ! میں کل ہی لکھنؤ سے واپس آیا ہوں، آپ کا خط ملا افسوس ہے اب وقت نہیں رہا اور لاہور آنا ممکن نہیں اور میں آپ کے والد صاحب اور آپ کی ملاقات سے ...... محروم رہوں گا۔ انشاء اللہ پھر کسی وقت ضرور حاضر ہوں گا۔

آپ کی نظم میں نے دیکھی بیشک خوب کہی ہے۔ آپ کو زیادہ تر داد لینے کی ضرورت نہیں میں خوشی خوشی داد دینے کو تیار ہوں۔ آپ مجھ سے رسالے کا نام پوچھتے ہیں آپ خود ایسی نئی نئی ترکیبوں کے مالک ہیں کہ میں آپ کے سامنے کیا کہوں؟ رسالے اردو میں اس قدر نکلے ہیں کہ اب ڈھونڈے سے نہیں ملتا اور اگر کوئی تجویز بھی کیا جائے تو خیال ہوتا ہے کہ شاید اس نام کا پہلے سے موجود ہے مثلاً ادب و لسان، البلد، بصیرت، درس، اس وقت یہ الفاظ خیال میں آ گئے تو لکھ دیے۔ پھر غور کروں گا۔ اگر کوئی اچھا سا نام مل گیا تو ضرور لکھ بھیجوں گا۔

عبدالحق

(مطبوعہ انتخاب لاہور، فروری مارچ ۱۹۲۶ء)

(۲)

مکتوب مہدی حسن احسن لکھنوی

اختر بیدار رنگین بیانی ...... شاد باش

دعا یا سلام یا جو کچھ مناسب حال و قبول مزاج ہو جواب دشمناں میں سربفلک کشیدہ پہاڑوں کے جوف میں شیشہ کے دروازوں والے کمرہ میں جس سے کوہ نینی تال کا منظر جانب شمال مطلع نظر تھا میں اپنے ناول کا آخری حصہ ختم کر رہا تھا کہ کوہستان میں بہارستان جلوہ افروز ہوا ...... ماہ گذشتہ سے ماہ حال کا بہارستان بہارستان ہے، جدید جہید پر آفریں!

اس زمانے میں جب ادبی رسائل حشرات الارض کی طرح باعث تکلیف روحانی ہیں یہ رسالہ اور اس کے مضمون نگار قابل قدر ہیں، ضرورت ہے کہ مضامین پر مغز ہوں، علمی ہوں پر زور ہوں حیات زبان اردو کے مصداق ہوں۔

نواب صاحب خیال کا خیال قابل تسلیم ہے کہ صنف غزل اپنی نزاکت کی وجہ سے تحمل بار مضامین علمیہ نہیں ہو سکتی اور اگر کوشش کی جائے تو تعریف غزل سے عریاں تر ترک کر دے گی۔ غزل کا تقاضہ کہ اس میں مضامین داخلی وار دات قلبیہ، جذبات ضمیر انسانی ہوں، ایسے لوگ بھی ہندوستان نے پیدا کیے ہیں کہ ان کی تخیل باوجود محاسن جدیدہ، دائرہ غزلیت سے باہر نہ ہو، نواب صاحب نے جو مختصر نوٹ مجیداں کے مذاق غزل کے باعث لکھا ہے۔ اس کا شکست پذیر ہوں۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ حضرت خیال ...... ایک ادیب کامل ہیں شہر ڈھاکہ میں ایک ادبی رسالہ میں میر انیس کے متعلق ان کا ایک مضمون نہایت عمیق و بسیط شائع ہوا ہے جس سے میر انیس کے واقعات تاریخی اور صحت کلام پر کافی روشنی پڑتی ہے۔

ان کے تحقیقات صحیح اور معلومات کلی نے گوارہ نہیں کیا کہ وہ ہندوستان کے خدائے سخن کے حالات جادۂ صحت سے متجاوز دیکھیں۔ ارباب قلم کی خود غرضیوں نے میر انیس کی سوانح عمری کو امیر حمزہ کی داستان سمجھ رکھا ہے بالا باختر کو چک باختر کی داستانوں میں ہر داستان گو ایک نیا فکر، ابتکار، جدت و بیان کا شرف حاصل کرتا ہے اسی طرح اس زمانے کے اہل قلم جو مشاہیر کے حالات لکھنے کو قلم اٹھاتے ہیں، ان کا نصب العین اپنی شہرت ہے نہ اظہار کمال ممدوح مسئلہ طولانی ہے، مختصر خط و کتابت میں گنجائش نہیں، پھر کبھی دیکھا جائے گا۔ دل میں بہت کچھ ہے وقت کافی نہیں ہاں صاحب مجھے لکھنا کچھ تھا اور لکھ کچھ گیا۔ بلا ارادہ گردش قلم کا تابع ہو گیا۔ معاف کیجئے تصویر کھنچ گئی بڑھاپے کی حماقت ابھی تو فوٹوگرافر کے گھر میں ہے۔ دو چار روز میں آپ کو پہونچ جائے گی آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ مختلف زمانوں کی تصویریں آپ کو ملنا چاہیے یہ انتظام ان افراد میں ہوتا ہے جن کی سوانح عمری وابستہ ترقی ہوتی ہے۔ اور وہ مشاہیر عالم کے ریکارڈ میں داخل ہونے کے خواہش مند ہوتے ہیں میں تو ایسے خاندان میں پیدا ہوا جو زمانہ حال کی وجاہت سے نفور تھا اور ایسے مکتب میں تعلیم پائی جہاں انگریزی تعلیم داخل کفر تھی خدا کی مرضی اور ضرورت الٰہی کا نصاب میں کیا ہوتا ہے

گئے دونوں جہاں کے کام سے ہم
نہ ادھر کے رہے نہ ادھر کے رہے

قدرت کا احسان عظیم ہے کہ بلا ارادہ میں نے ان منازل کو طے کیا جس کی راہ میں قدرداں آنکھیں بچھائے ہوئے ملتے ہیں ...

خدا کی دین کا موسیٰ سے پوچھیے احوال
کہ آگ لینے کو جائیں پیمبری ہو جائے

ناول ختم تو ہوا نظرِ ثانی باقی ہے۔ اس کے متعلق پھر کبھی باتیں کروں گا کیونکہ آپ کے عنایت نامہ کا ایک یہی سوال ہے۔ تقریباً ایک ہفتہ پہاڑ پر قیام ہے جواب مل سکتا ہے۔ آج رات کی فکر کے تین چار شعر لکھ دوں۔ عالمِ غربت کے تجربات کا ترجمان ہے!

احسن

(مطبوعہ بہارستان جولائی ۱۹۲۶ء)

(۳)

مکتوب مرزا یاس یگانہ چنگیزی لکھنوی

کرمی حضرت اختر دامت الطافکم

سلام شوق۔ بہارستان کا جون نمبر موصول ہوا محاسن صوری و معنوی پر اظہار خیال کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی بہارستان خود اپنے منہ سے بولتا ہے۔ بقول شخصے

بہار عالم حسنش دل و جان تازہ می دارد
برنگ ارباب صورت را ببو ارباب معنیٰ را

مولوی طفیل احمد صاحب عارف بدایونی کے اشعار پر شاعرانہ وجد آیا کیا خوب فرمایا ہے ؎

نشان مرد معنی گرد و از صورت پدید اینجا
بشکل قفل ابجد نیست پروائے کلید اینجا

اس ذوقِ نظر کا کیا کہنا اگر مردِ معنی کی جگہ حسن معنی فرماتے تو کلام کا حسن دوبالا ہو جاتا۔ دنیا کے حسن فریب اور مشتبہ نظر کو مصنف نے اس شعر میں کس فصاحت اور بلاغت کے ساتھ قلمبند فرمایا ہے ؎

اسیر دام موج آب شد ہر کس کہ در شتی   بصید خانہ یک جام حباب آدم خرید اینجا

مقطع کے پہلے مصرعہ میں (ندانم نشتر مژگاں خونریزش چہ دید عارف) ایک ایسا سہو واقع ہوا ہے جس سے مصرع ناموزوں ہو گیا مگر یہ ایسا سہو ہے جس کے مرتکب بڑے سے بڑے استاد ہو چکے ہیں خیر سہو اور خطا تو انسان کی سرشت ہے اور خوردہ گیری اس کی عادت۔ مگر باایں ہمہ حسنِ کلام اپنا اثر کیے بغیر نہیں رہتا کاش مولانا موصوف میرا غائبانہ سلام و نیاز فرماتے۔

حضرت ثاقب بدایونی کا کلام پہلے بھی زینت افزائے بہارستان ہوا ہے ہندوستان کے بعض دوسرے چند باناز افراد میں سے ایک ہیں جن پر صحیح معنی میں شاعر کا اطلاق ہو سکتا ہے بہارستان میں آپ کی جو غزل شائع ہوئی ہے اس کے تین شعر بالخصوص نظروں کی خاص توجہ کے مستحق ہیں۔

عمر خضر کے انداز ہر نفس میں پاتا ہوں
زندگی نئی پائی آپ سے جدا ہو کر
بڑھتا ہے نہ گھٹتا ہے کرتے ہیں جیسے ہیں
درد پر خدا کی مار دل ہی رہ گیا ہو کر
نامراد رہنے تک نامراد جیتے ہیں
سانس تک نہ لی ہم نا دم دم سا ہو کر

میں اس خط میں ان اشعار پر اجمالی رائے بھی ظاہر کرنے کی گنجائش نہیں پاتا البتہ اتنا کہہ دینا ضروری سمجھتا ہوں آخری شعر جس نازک حقیقت کا حامل ہے طبقۂ شعراء میں شاید ہی دو چار ایسے نکلیں گے جو اس کی حقیقی لذتوں سے آشنا ہوں گے اس شعر کی شرح بشرط فرصت آئندہ کسی موقع پر کی جائے گی۔ اس وقت فقط اتنا عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ چار پانچ سال ہوئے میں نے بھی اسی حقیقت سے متاثر ہو کر ایک شعر کہا تھا اور اسی وجہ سے حضرت ثاقب کے اس شعر نے مجھے پھڑکا دیا میرا شعر یہ تھا

سانس لیتا ہوں تو آتی ہے صدائے بازگشت   کون ہوگا کہ ایک نالہ رسا ہو جائے گا

حصۂ نثر میں آپ جہاں تشنگان تحقیق کے لیے پر مغز مضامین مہیا کرتے رہتے ہیں وہاں ارباب تفریح کے لیے بھی ادب لطیف کے دلچسپ نمونے پیش کرتے ہیں اور آج کل ادبی رسالوں کی ترقی کا بڑا ذریعہ یہی ہے۔ بہارستان ابھی چند دنوں سے اسٹیج پر آیا ہے مگر چشم بد دور اتنے ہی دنوں میں اس نے وہ اعتبار حاصل کر لیا کہ رسالہ اردو اور معارف کے سوا شاید ہی کوئی دوسرا رسالہ اس کی ہمسری کر سکے یہ بیگمات کہ آپ نثر و نظم دونوں پر یکساں قدرت رکھتے ہیں اور ہر جگہ آپ

(باقی صفحہ ۸ پر)

۱؎ یہ اشعار ذیل میں درج ہیں "نگار رعنا" کی سرخی سے، اختر شیرانی کے نوٹ کے ساتھ جولائی ۱۹۲۶ء ہی کے شمارے میں شائع ہوئے ہیں۔

"مولانا احسن صاحب تجمد کی یہ غزل تازہ بہ تازہ نو بہ نو کا حکم رکھتی ہے اور اس قدر کہ حسینوں کی ڈاک سے" لاہور "آنے تک کی مدت ۔۔۔ "بہارستان کے اشاعتی مرحلوں میں جو دن گزرے ہیں" اُن سے قطع نظر یوں کہنا چاہیے کہ (بقول مولانا) آج رات کی فکر کا نتیجہ ہے۔ غزل کی داد دینے کے لیے متوجہ ہونا چاہیے" الغرض شعر کے بارے میں ہمیں اس قدر عرض کرنے کا حق ضرور ہے کہ یہ مولانا کی شاعری ہے ورنہ اہل نظر تو یہ فاصلہ بعید خیال و منقول ہی کی ایک روشن حقیقت ہے" (اختر)

انساں کو قدرت نے جو فرصت کش دنیا کیا   نہ میرے دامن پر تقدیر کا دھبا تھا
کس نے تھا میری آنکھوں پہ پردہ گرایا تھا   یہ نہ ظاہر ہوا مجھ پر یہ حقیقت کیا تھا
وقت کی کچھ باتیں رنگیں تصویر میں   ہر شب کا سحر ہونا دلچسپ تماشا تھا
وہ اور مرا تم کرتے ہو ستی کی باتیں   رونا ہی بہت پر فطرت کا تقاضا تھا
آسان سے ہو جو ہم منزل پہ گئے ان کو   دہشت سے جسے کہتے ہیں یار کا یہ دم تھا
وہ فصل گئی احسن جس میں دشت جنوں آباد
صحرا ہوا جادہ تھا بہتا ہوا دریا تھا

سید فضل المتین

ترجمان

یہ لمحے! بے زباں لمحے!!
جنھیں تنہائی کہتا ہوں
مرے ہمراز و ہمدم ہیں
کسی دن ان کی خاموشی
سنائے گی
مرے حالاتِ ناگفتہ
یہ میرے ترجماں ہوں گے

اشفاق احمد اعظمی

میرا وجود

میرے وجود کو اس دنیا نے جب چاہا ہے جھٹلایا ہے
اور مرے اس نقشِ جبیں کو جب دیکھا ہے جھٹلایا ہے
میں نے بھی لیکن ہر جگ میں اس دھرتی پر جنم لیا ہے
اور جہاں کی پیشانی پر اپنا افسانہ لکھا ہے
اپنے احساسات کی میں نے بار بار بکھیری ہیں کرنیں
بار بار خوابیدہ دلوں میں چھوڑ گیا ہوں اپنی یادیں
ہر جگ میں میں نے دنیا سے اپنی خودی کو منوایا ہے
ظالم وقت کا تنکا مرے دامن میں ٹوٹ کے تب آیا ہے
میرے بدلتے ڈھنگ سے پھر تیری دنیا نے پیار کیا ہے
بدل گئی ہے اس کی روش بھی جب میرا تیور بدلا ہے
ہے یہ مرے ہی وجود کی بارش جس سے اب عالم بھیگا ہے
جو کچھ اب تو دیکھ رہا ہے لکھا ہوا "میں نے لکھا ہے"
تیرے ایک کھٹکتے رہنے سے کب میرا دھارا ٹوٹے گا
ہاں میں جب جب بھی بدلوں گا وقت تھکا ہارا ہوئے گا

عبدالرحیم نشتر

دھرتی کا سوال

رات کے گہرے سناٹے میں
دھرتی سب سے پوچھ رہی ہے
بولو
کیا تم جاگ رہے ہو؟

شفیق رحمانی

ایک قطعہ

یہ کہنہ رسم و روایات کے عظیم ستون
جو کائنات کی بنیاد سمجھے جاتے ہیں
سطحِ ذہن پہ ابھرے ہوئے حسین اصنام
نئے شعور کی گرمی سے پگھلے جاتے ہیں

میر کی شخصیت کی جامع شبیہ

لکھنؤ، ۲۴ جون۔ میر تقی میر کی ایسی شبیہ پر جو ان کے کردار، مزاج اور رجحان کے مطابق ہو غور کرنے کے لیے آج شام یہاں میر اکاڈمی کا ایک جلسہ لاری ہاؤس میں پروفیسر سید احتشام حسین صدر شعبۂ اردو الہ آباد یونیورسٹی کی صدارت میں ہوا۔

ایک مقامی فنکار عظمت اللہ خاں کی تیار کی ہوئی وہ شبیہ جو تذکروں میں مذکور میر کی مزاجی کیفیت نیز کلیات میر میں مسطور بعض ان اشعار کی روشنی میں جو میر کے ذہنی رجحان کی غمازی کرتے ہیں جلسے میں زیر بحث آئی۔ یہ شبیہ پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب لکھنوی کی نگرانی میں بڑی محنت سے تیار کی گئی تھی۔

جلسے نے شبیہ کو فنی لحاظ سے بہترین شاہکار قرار دیتے ہوئے مجموعی طور پر اسے میر کی خیالی تصویر سے بہت زیادہ مطابق نہیں پایا۔

محمد رضا انصاری نے بحث کا آغاز کرتے ہوئے زیر بحث شبیہ کو میر کی نازک اور حساس طبیعت کی عکاسی کرنے کے بجائے تنگی اور بیزاری کا ترجمان قرار دیا۔

ڈاکٹر خورشید الاسلام (مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) نے خیال ظاہر کیا کہ میر کا اصلی روپ دردمند انسان اور سچے عاشق کا ہے جو اس شبیہ سے ظاہر نہیں ہوتا ہے۔

پروفیسر احتشام حسین نے بھی زیر بحث شبیہ کو میر کی صحیح عکاسی کرنے میں ناکام ٹھہراتے ہوئے سوال اٹھایا کہ کیا یہ ضروری ہے کہ میر کی شبیہ بہرحال پیش ضرور کی جائے؟

ہندی کے ممتاز ادیب پنڈت امرت لال ناگر نے خیال ظاہر کیا کہ کوئی ایک خیالی شبیہ کسی ایک شخصیت کی مکمل عکاسی کر ہی نہیں سکتی ہے، ایسا کیوں نہ کیا جائے کہ متعدد شبیہوں کے ذریعہ میر صاحب کے مختلف رجحانات کو ظاہر کیا جائے۔

جلسے کی کارروائی میں پروفیسر رادھے شیام رستوگی (لکھنؤ یونیورسٹی)، حکیم عبدالقوی دریابادی، فرقت کاکوروی، ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی (لکھنؤ یونیورسٹی)، عمر انصاری اور مولانا خیر بہوروی نے بھی حصہ لیا۔

خیر صاحب نے صدر میر اکاڈمی جناب مقبول احمد لاری کی نیابت کرتے ہوئے بتایا کہ میر اکاڈمی کی طرف سے شائع ہونے والی کتاب "حدیث میر" کیلئے میر صاحب کی شخصیت کی ایک جامع شبیہ کی تلاش ہے اور اس سلسلے میں شروع کے جلسے کی دعوت دی گئی ہے۔ انھوں نے میر کی رائج شبیہ کے بارے میں پروفیسر مسعود حسن رضوی کا یہ قول دہرایا کہ مصور نے کسی بانکے کی شبیہ کھینچ کر رکھ دی ہے۔

ڈاکٹر محمود احمد لاری کی طرف سے اختتام جلسہ پر حاضرین کا شکریہ ادا کیا گیا۔

(قومی آواز)

نادم سیتاپوری

گورِ غریباں ـــــــ سرشار کا ایک المیہ ناول

پنڈت رتن ناتھ سرشار نے اردو ناول نگاری کو جن نئی راہوں سے روشناس کرایا "طنز و مزاح" اس کی امتیازی خصوصیت ہے اور اس کی جھلکیاں "فسانۂ آزاد" کے علاوہ ان کے دوسرے ناولوں میں بھی کچھ نہ کچھ موجود ہیں۔ اس لیے یہ بات کچھ کم تعجب خیز نہیں ہے کہ ان کے ناولوں میں ایک "ٹریجڈی" کا نام بھی ملتا ہے یہ ناول ابتک مری نظر سے نہیں گزرا اور جہاں تک میں سمجھتا ہوں شاید اس کی طباعتی تکمیل بھی نہیں ہو سکی۔ اور اگر ہوئی بھی ہو گی تو غالباً اس کا اشاعتی حلقہ بہت ہی محدود رہا ہو گا۔

"گورِ غریباں" کی تصنیف کی خوشخبری اب سے پینسٹھ برس پہلے "اودھ پنچ" نے اودھ اخبار اور ایڈوکیٹ کی زبانی سنائی تھی اور اپنے ایک ادارتی نوٹ میں اس کی اشاعت کا ذکر کرتے ہوئے سرشار کے ایک دوسرے ناول "ملک الموت" اور ایک مثنوی "پیرِ نابالغ" کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ "اودھ پنچ" نے اس نوٹ میں لکھا ہے۔

"الحمد للہ بعد مدت بسیار ہمارے دوست پنڈت رتن ناتھ سرشار پھر فسانہ نگاری کی جانب متوجہ ہوئے ہیں۔ "ایڈوکیٹ" اور "اودھ اخبار" مژدہ سناتے ہیں کہ ایک ناول "گورِ غریباں" آپ نے تصنیف فرمایا ہے اور عنقریب شائع ہو گا۔ مگر معلوم نہیں اس میں ایسی ظرافت ہو گی کہ آزادوں کا مردہ بیتیاں یاد آئے یا واقعی حیدرآباد کے مشہور امیدواروں کے قبرستان کا سین دکھایا جائے گا۔

دوسرا ناول "ملک الموت" ہے واقعی بڑا ہی سنسنی خیز ہو گا جس کے پڑھنے سے آدمی کو سناٹا آجائے گا۔ کیا معنی کہ ایک دفعہ دشمنوں نے مشہور کر دیا تھا پنڈت صاحب خدانخواستہ انتقال فرما گئے۔ شکر ہے کہ وہ خبر تو جھوٹ نکلی۔ مگر اب اس سے اتنا پتا چلتا ہے کہ اگر اس زمانے میں ملک الموت سے دور کی علیک سلیک ہو گی تو تعجب نہیں۔

تیسری مثنوی "پیرِ نابالغ" ہے جو تیار ہو رہی ہے مگر ہمارے نزدیک اس کے تمام کرنے میں مجلت بھی نہ چلنے پائے کیا معنی۔ جس قدر زمانہ گزرتا جائے گا مضامین مثنوی واقفیت کی صورت پکڑتے جائیں گے۔

(ضمیمہ اودھ پنچ لکھنؤ، ۲۷ر اپریل ۱۸۹۹ء صفحہ ا کالم ۳)

پھر ایک ہفتے کے بعد "اودھ پنچ" نے "گورِ غریباں" (ناول) کے عنوان سے ایک دوسرا نوٹ لکھا۔

"جاگے۔ جاگے۔ پنڈت رتن ناتھ صاحب جاگے۔ خوابِ خرگوش سے چونکے! یا یوں کہیے کہ "حضرت سرشار لکھنوی" کا نشۂ بادہ سکوت اُترا ـــ! اور آپ پھر اس ناول نویسی کے اکھاڑے میں چٹ لنگوٹ باندھ کر دھم سے کود پڑے ـــ ذرا کان پھٹ پھٹا ڈالیے۔ لے اب "یا علی" کہہ کر ڈنڑ تو پیل ڈالیے ـــ!

"گورِ غریباں" جو ناول ابھی حال میں پنڈت صاحب نے لکھا ہے وہ "ٹریجڈی" ہے اور نہایت خوب لکھا ہے بالفعل چند سطور جو بطور نمونہ ایک دوست نے حیدرآباد سے بھیجے درج ذیل ہیں اس سے زبان اور طرزِ بیان کا حال ظاہر ہو جائے گا گو اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے مگر تاہم نیا رنگ بھی دیکھ لیجیے۔"

(اودھ پنچ لکھنؤ، ۴ر مئی ۱۸۹۹ء جلد ۲۳، شمارہ ۱۸، صفحہ ۵، کالم ۳)

یہ دونوں اقتباسات اب سے پینسٹھ سال ادھر کی ادبی سرگرمیوں کے عکاس ہیں جن سے ایک طرف تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ سرشار اپنے آخری ایام زندگی میں ناول نگاری چھوڑ چکے تھے۔ دوسرے ادبی حلقوں میں ان کی تصانیف کا انتظار کس اشتیاق سے کیا جاتا تھا؟

جہاں تک اس ناول کی تصنیف کا تعلق ہے ان دونوں اقتباسات سے اس حقیقت پر روشنی پڑتی ہے کہ یہ ناول سرشار نے مکمل کر لیا تھا اور "مثنوی پیرِ نابالغ" زیرِ تصنیف تھی۔ یہ دونوں کتابیں چند ہفتوں کے بعد جب پریس پہنچیں تو "اودھ پنچ" نے لکھا۔

"پنڈت رتن ناتھ صاحب سرشار کا ناول مہاراجہ پیشکار بہادر کے علاقہ پیشکاری میں طبع ہو رہا ہے۔ تعریفیں تو بڑی سنتے ہیں مگر دیکھیں تو معلوم ہو کیسا ہے؟ ان کی مثنوی "پیرِ نابالغ" بھی چھپ رہی ہے ـــ "اب میرے کو کام ہے وہ یہ کہ میری ماں جو روٹی پکاتی ہیں اور جن کا نام "نامراد" ہے وہ کتاب تصنیف کر رہی ہیں اور میرے کو شکر کی ترکیب بتائیں گی۔ حاضر ہوتا ہوں۔" (اودھ پنچ ۱۳ر جون ۱۸۹۹ء جلد ۲۳، شمارہ ۲۳)

"اودھ پنچ" کے حیدرآبادی دوست نے اس ناول کا جو نمونہ بھیجا تھا وہ بہت ہی مختصر اور اس زمانے کی اصطلاح میں "مشتے از نمونہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" ہی کہا جا سکتا ہے۔ لیکن بقول "اودھ پنچ" کے سرشار کا "نیا رنگ" قابل دید ضرور ہے۔

"ایک کوہ فلک شکوہ کی بلند چوٹی پر جو آسمان سے باتیں کرتی تھی اور نظارت و خوشنمائی میں یکتائی کا دم بھرتی تھی۔ دو گلرخان گلفام، ناز آفریں، نازک اندام، دلربا دلارام، لب لعل، شکر خا نوک مالک کے بوسہ گاہ۔ پتلیاں سویدائے دل کی طرح سیاہ سہی قد رشک شمشاد قامت زیبا، شل سرچمن زار ناز آزاد، غنچہ خنائی مرجان، غیرت لعل بدخشاں۔ آنکھیں گردش نیل و نہار دکھاتی تھیں۔ دونوں شکل شنگل و شنگ، شوخی میں دونوں کا چرچا تا ہوا رنگ ایک کان حسن، دوسری جان حسن۔ دونوں طناز و سراپا انداز، فسوں ساز، عشوہ پرداز، خرام ناز تھیں، برق دمان میں یہ چمک کہاں؟ داعنی میں یہ دمک کہاں۔ بجلی وسپے کی تی ہے۔ ان کے رگ و پے میں دریا چہ نور جاری ہے۔ وہ نور جبیں کو دیکھ کر فرشتوں تک عقل عاری ہے۔ اس پر طرہ علم ستی و نادانی، الہڑ اور باوری جوانی متوالی دیوانی۔ کبھی گل ہائے تر و معطر کی کسی روش خنداں پر جھوم کر چلیں تو طاؤس زمرد بیں پر و بال ابر برشگال کے دھوکے میں پر نقش و نگار کھول کر ناچنا و زہرہ رقاصہ فلک تک کو وجد میں لاتا تھا۔

ان کے ساتھ "ستولیا" نامی ایک چھوکری قتالہ عالم تھی اس نے مخاطب ہو کر کہا۔

سرکار۔ ذری ادھر آئیے۔ سان رسان نہ آئیے ذرا قدم بڑھاتے ہوئے آئیے۔

جا کے دیکھا تو ایک دلربایانہ انداز کے ساتھ ذرا چیں بہ جبیں ہو کر بولی ـــ

یہ کہو۔ ہیٹھ سے پاؤں نکالے ہیں۔ دل کے پنجرے میں یہ کھوٹ کے جانور پالے ہیں۔

ستولیا نے کہا ـــ

اس نوک کا ایسا جوان گھبرو کوئی دکھا تو دے۔ آفتاب کو قندیل بنائے اور ساری خدائی میں ڈھونڈھ ڈھونڈ لائے۔ ہائے میرا بس چلے تو اپنے کچھ کانوں اور اس کو نگھوں۔ سلیمان کو خاتم۔ جم کو جام۔ سکندر کو آئینہ۔ زاہد کو رود و ادعیہ۔ عاشق کو کرشمہ معشوق زہرہ تمثال۔ رندان بدمست کو بلوریں ساغر بادہ پرتگال ـــ بلبل کو دہن حضرت یعقوب کو بوئے پیرہن مبارک۔ یہاں تو بس یہ دھن ہے کہ جیب تنگ یہ "گورا" کا "خوب صورتا لونڈا ہم آغوش ہے۔"

ادھر یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ اس امرد پرست نے ایک پھول دامن کوہ سے توڑا اور اس چھوکری معشوقہ طرار نے جو اس کی عاشق زار بنی تھی حسرت کے ساتھ کہا ـــ

گلچیں سمجھے کیا۔ نرمی بلا ہے
گل توڑ کے تو تو گود بھر لے

"گور غریباں" کے مندرجہ بالا اقتباس سے اگرچہ سرشار کے اس نئے رنگ (ٹریجڈی) پر کوئی خاص روشنی نہیں پڑتی ہے پھر بھی ان کے آخری دور کے ایک ناول کی نشاندہی ضرور ہوتی ہے۔ یہ ناول طباعت کے مراحل طے کر کے کب اہل ذوق تک پہنچا؟ اس کے متعلق کچھ کہنا دشوار ہے۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں سرشار کی مطبوعہ تصانیف میں اس کا ذکر نہیں ملتا۔

"ملک الموت" مکمل ہوئی یا نہیں؟ اس کے بارے میں بھی میری معلومات "اودھ پنچ" تک محدود نہیں اور "اودھ پنچ" کے مذکورہ بالا شماروں میں اس کی اشاعت کے متعلق کوئی تفصیلات نہیں ملتیں۔ اسی طرح ان کی مثنوی "پیر نابالغ" بھی غیر معروف ہی معلوم ہوتی ہے۔ کچھ خیال پڑتا ہے کہ پنڈت جگ موہن ناتھ شوق رینہ نے ان کی کوئی غیر مطبوعہ منظوم تصنیف تلاش کی تھی! ممکن ہے یہی مثنوی ہو جسے انھوں نے اپنے تذکرہ "بہار گلشن کشمیر" میں شامل کیا ہو؟

(صفحہ ۴ سے آگے)

قوت اختراع و تجدید نمایاں ہے مگر میں خان بہادر میرزا صر علی خاں صاحب ایڈیٹر صلائے عام کی طرح آپ کو یہی صلاح دوں گا کہ آپ نثر کو اپنا مستقل فن بنائیں اگر سلسلۂ مشق یونہی جاری رہا تو آپ کی نثر کا تیکھا پن ایک دن لٹریچر میں ایک نیا انقلاب پیدا کرے گا۔

(مطبوعہ بہارستان جولائی ۱۹۲۶ء)

(۴)

مکتوب ضیاء الملک (ملا رموزی)

بھوپال
۷ اگست ۱۹۲۶ء

زاد لطفہٗ سلام مسنون

اس وقت بہارستان کا پانچواں نمبر سامنے ہے میں نے اتنے عرصہ تک جو خموشی اختیار کی وہ کسی عذر کے قابل نہیں بلکہ میں مسلمانوں کی قوت عمل اور حوصلے سے چونکہ مایوس ہو گیا ہوں اس لیے بہارستان کے حوصلے کو دیکھ رہا تھا مگر بہارستان کے پیہم یک یعنی مسلسل پانچ نمبروں نے جب یقین دلایا کہ "بہارستان" نہیں بلکہ اختر و رنگین زندہ رہنے کے لیے پیدا ہوئے ہیں اور بہارستان کا ہر صفحہ جہاں جمال فطرت کی گل ریزیوں کا ایک جلوہ پرور منظر ہے وہاں وہ اختر رنگین کے عزم و ثبات عمل کا قابل تقلید اور رجسٹری شدہ قبالہ بھی ہے اس لیے میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ اب بہارستان کو "زندہ جاوید" کہوں اور کم از کم شیرینی کو آب حیات والے خضر علیہ السلام اگرچہ خضر علیہ السلام حشر تک بھی ایسی قیامت آفریں تصاویر شائع نہیں کر سکتے خصوصاً تصویر "آشنا" جس نے خدا جانے کتنے ناصحوں اور متقیوں کو اپنے عہدوں سے برطرف کرا دیا ہو گا۔

حقیقت میں "بہارستان" آپ کی سنجیدگی سلامت ذوق اور زندہ دلی کا عدیم النظیر ثبوت ہے پھر اس کی طباعت کی نفاست اور رنگینی آپ کی اس مالی حالت کے سبب صحت ہونے کا خاصہ طبعی سرٹیفکیٹ ہے جو عام رسائل میں "سقیم" رہا کرتی ہے اور وہ آئے دن اعانت خریداروں کے اضافے، اپیل بالائے اپیل اور چندے کے نسخے چھاپا کرتے ہیں پھر بھی وہ ایک ہی ششماہی میں اس طرف چل دیتے ہیں جس طرف آہ کر چکے ہیں اور آپ کو معلوم بہارستان ایک دن چلنا ہی ہے (نصیب اعداء)

آپ بہارستان کی جمال آرائیوں پر جو گراں قدر رقم صرف کرتے ہیں وہ اردو صحافت میں بلا شائبہ خوشامد ممتاز و مختص ہے پس اگر موجودہ رسائل میں "قصہ گل بکاؤلی" اور علی بابا چالیس چور یا تصویر شکے مانند چند رسائل ہیں بھی تو انھیں بہارستان کی تقلید کرنا چاہیے اب آپ کی ان مالی و فکری قربانیوں پر دیکھنا یہ ہے کہ قدرداں اس کی عمر و بقا کے لیے کیا کچھ کر چکے۔ اور ابھی انھیں کیا کچھ کرنا ہے۔؟؟؟

میرے پاس اس وقت اردو کے تقریباً چالیس پچاس ٹن وزنی رسالے آتے ہیں اور اگر آپ مجھے بدذوق نہ کہیں اور ایڈیٹر حضرات ان رسالوں کو میرے نام بند نہ کر دیں تو میں صاف کہتا ہوں کہ ان تمام رسالوں کو ردی میں فروخت کر کے اپنے تئیں دن کے ناشتے کے دام وصول کر لیتا ہوں۔ لیکن میں سچ نہیں تو کیا جھوٹ کہتا ہوں کہ بہارستان کو میں زیادہ عزیز رکھتا ہوں اور اس کو رام لال دکاندار کے حوالے نہیں کرتا جو میرے "ردی جنرل مرچنٹ یا ردی برادرس اینڈ کو" ہیں۔ . . . . بہارستان کی تصاویر کا انتخاب بھی قابل داد ہے میرے خیال میں اس میں ایک تصویر موجودہ ارباب علم و کمال اور مشاہیر انشا پردازوں کی ہونا چاہیے کیونکہ صرف اردو انشا پردازی ہیں جن کی دماغی اور فکری خدمات کی کوئی حوصلہ افزائی نہیں مگر اس سلسلے میں صرف برادرم سلطان حیدر جوش کی تصویر کا مخالف ہوں یا پھر وہ بہارستان کی ہر اشاعت میں آنے کا وعدہ کریں تو پھر چل انھیں سے کیجیے الغرض مجلہ بہارستان من حیثیت المجموع عزیز خاطر آشفتہ حالاں ہے

(بہارستان اکتوبر ۱۹۲۶ء)

مراسلات

حالیہ مردم شماری کے اعداد و شمار بابت اُردو

آپ کے مختلف اداریوں اور نگارشوں سے یہ بات واضح ہے کہ آپ حالیہ مردم شماری کے اعداد و شمار بابت اردو سے مطمئن نہیں ہیں یہی کیفیت بہار شریف کے رہنے والوں کی ہے۔

اس سلسلہ میں ناچیز کی یہ رائے ہے کہ انجمن اپنے طور پر مردم شماری کا بیڑا اٹھائے۔ یہ کام نہایت مشکل ہے لیکن اسے قدرے آسان بھی بنایا جاسکتا ہے۔ اجمالی خاکہ یہ ہے:

ہم نے جسے پورے منظور کیا ہے انجمن کی زیادہ سے زیادہ شاخیں قائم کی جائیں چنانچہ جس دیہات میں اردو بولنے والوں کی تعداد ۱۰۰ (ایک سو) ہو وہاں انجمن کی مقامی شاخ ہونی چاہیے۔ اس طرح ہندوستان کا کوئی دیہات انجمن کی روشنی سے محروم نہ رہے۔ اور جب انجمن کی جڑیں ملک کے گوشہ گوشہ میں پھیل جائیں گی تب ہی انجمن ایک مضبوط اور تناور درخت کی شکل اختیار کرسکے گی۔

علی گڑھ، دہلی، بہار، پنجاب اور دوسرے مقامات کے سرگرم کارپردازانِ اردو کے مجموعہ کا نام انجمن ترقی اردو (ہند) نہیں ہوسکتا۔ انجمن اگر ایک ملک گیر تحریک کا نام ہے تو اس کی سرگرمیاں بھی ملک کے طول و عرض میں نظر آنی چاہیے۔ اس سلسلہ میں ہمیں پوری سنجیدگی اور سرعت سے غور کرنا ہے۔ اور اس طرح جب علی گڑھ کا ناطہ ملک کے ہر دیہات سے جڑ جائے گا تو اردو مردم شماری کا کام نسبتاً آسان ہوسکتا ہے۔

میں بذات خود ۴ کروڑ ۳۸ لاکھ کے اعداد سے مطمئن نہیں ہوں میرا خیال ہے کہ یہ عدد تقریباً ۸ کروڑ تک جاتا ہے۔ کتنے لوگ ہیں جنھوں نے آنند نرائن ملا کی طرح اندراجات کی جانچ کی ہوگی۔

دوسرے بہار شریف، یوپی، بہار، پنجاب، دہلی، مدھیہ پردیش میں اردو کو قانونی علاقائی زبان کی حیثیت دلوانے کے لیے حکومت ہند کی خدمت میں پرزور نمائندگی کی ضرورت ہے۔ اس ضمن میں ہماری لاتعداد شاخوں کی قیام سے جدید موجودہ مقامی اردو کی بزموں کے تعاون سے ہم اپنا کیس ملک گیر ہونے پر مضبوط کریں۔ اور ان گنت دستخطوں کے محضر نامے ملک کے گوشے گوشے سے دہلی بھیجیں۔ یہ منظم اردو عوام کی موثر آواز ہوگی اور اس کو حکومت ان سنی نہیں کرسکتی۔

یا ایک نسبتاً سہل کام یہ ہے کہ ملک کے تمام اردو کی ترقی و ترویج کے اداروں، بزموں، انجمنوں اور محفلوں سے حکومت کے پاس میمورنڈم بھیجے جائیں۔ میمورنڈم کا مضمون یا اس کے نکات تیار کرکے مذکورہ اداروں تک پہنچائے جائیں۔

بہتر ہوگا اگر ہر ریاستی انجمن یا مرکزی انجمن اپنے طور پر میمورنڈم چھاپ لے اور ملک کے ہر دیہات اور ہر قریہ میں تقسیم کردے۔ ادیبوں اور شاعروں کے دستخط کی مہم ایک معاون تحریک ہوگی ہمیں صرف ادیبوں، شاعروں اور مفکروں کا تعاون نہیں چاہیے ہمیں تو سیاسی پارٹیوں اور حکومت بنانے والے عوام کے ساتھ کی ضرورت ہے

ایک بات اور رہ گئی ہے وہ یہ کہ مرکز ریاست سے اور ریاست مقامی شاخوں سے ماہانہ ریٹرن (Return) منگوائے کہ وہ اپنے حدود میں کیا کررہے ہیں۔

اگر کچھ کام نہیں ہورہا ہے تو (Nil Report) ہی حاصل کرے۔

اس سے کچھ نہیں تو کم از کم تعلق اور رشتہ تو قائم رہے گا۔

ترک کیجیے نہ تعلق ہم سے
کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

دوسن یوسف حسن سکریٹری انجمن ترقی اردو بھیمرا ضلع ...

حضرت نور محمد کامیاب صبر حدی

ضلع جونپور کے قصبہ صبر حد میں اٹھارویں صدی کے وسط میں ایک صوفی شاعر گزرے ہیں نور محمد۔ ہندی ادب کی تاریخوں میں ان کا ذکر ملتا ہے۔ ڈاکٹر محمد حسین خان نے اپنی کتاب ہندی ادب کی تاریخ میں نور محمد صاحب کا تذکرہ کیا ہے۔

موصوف ہندی اور فارسی کے صف اول کے شاعر تھے "اندراوتی" "انل دمن" اور "انوراگ بانسری" یہ تین ہندی تصانیف ان سے منسوب کی جاتی ہیں۔ فارسی میں بھی ان کی ایک کتاب ہے جس کا نام نادر تحفۃ الحقائق ہے۔ لیکن ان کی مذکورہ تصانیف مجھے باوجود تلاش و جستجو نہیں مل سکیں۔

قارئین ہماری زبان میں سے جن صاحب کی نظر سے مذکورہ تصانیف گزری ہوں، از راہ ادب نوازی مجھے مطلع فرمائیں کہ آیا وہ ان کے ذاتی کتب خانہ کی زینت ہیں یا ہندوستان کی کسی لائبریری میں موجود ہیں شکر گزار ہوں گا۔

محمد ... اللہ صبر حدی
بمقام و پوسٹ صبر حد ضلع جونپور (یوپی)
SABRAHAD
(JAUNPUR)
U.P

پنجاب میں انجمن ترقی اردو کی شاخیں قائم کرنے کی اپیل

۸ر جولائی۔ شری اوم پرکاش ملک صوبائی جنرل سکریٹری انجمن ترقی اردو ہند نے ایک بیان میں پنجاب کے اردو بہی خواہوں سے اپیل کی ہے کہ وہ اپنے اپنے شہروں اور قصبوں میں انجمن کی شاخیں قائم کریں۔ سال رواں کے لیے انجمن کا ممبر بننے کی آخری تاریخ ۲۵ر جولائی ہے جب کہ ۱۰ر اگست تک مقامی شاخوں کے چناؤ ہوجانا ضروری ہیں۔ ممبر سازی کی سالانہ فیس صرف ۲۵ پیسے ہے۔

شری ملک نے کہا کہ انجمن کا مقصد اردو زبان کے تحفظ اور احیاء و بقا کے لیے کوشش کرنا ہے۔ کم از کم ۲۰ ممبرین پر ایک مقامی شاخ قائم ہو سکتی ہے۔ اور ہر بیس افراد کے پیچھے ایک ممبر صوبائی انجمن تمام کا ممبر ہوگا جو اپنے صوبہ کی شاخ کے عہدیداران کو چنے گا۔

آخر میں شری ملک نے اردو زبان کے ادبا، شعراء اڈیٹر صاحبان و دیگر حضرات سے اپیل کی کہ وہ انجمن کی اس ممبر سازی کی مہم کو کامیاب بنائیں۔ ممبر شپ کے فارم صوبائی دفتر ... جالندھر میں ... سے حاصل کیے جاسکتے ہیں۔

(اوم پرکاش ملک جنرل سکریٹری)

بزم سخن بھاگلپور کی ایک میٹنگ

زیر اہتمام بزم سخن بھاگلپور کی ایک خصوصی میٹنگ بزم کے دفتر میں تاریخ ۷ر جولائی ۱۹۶۵ء کی شام کو منعقد ہوئی جس میں اور مسائل کے علاوہ خصوصاً بزم کے ذیلی ادارہ مجلس اشاعت کے سکریٹری کی کارگزاریوں پر غور کیا گیا اور یہ فیصلہ کیا گیا کہ جناب شاغل قادری کے مجموعۂ کلام "متاعِ شوق" کے چھپ جانے کے بعد اگست کے پہلے ہفتہ میں مجلس اشاعت اپنا دوسرا اشاعتی پروگرام مرتب کرے گی۔ یہ دوسرا پروگرام جناب کریم اسعدی کے مجموعۂ کلام کی اشاعت کے سلسلے میں ہوگا۔

(عبدالرحیم فطرت)

اردو داخلہ مہم کی طرف توجہ کی اپیل

لکھنؤ ۷ر جولائی۔ انجمن ترقی اردو کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر شجاعت علی نے ایک بیان کے ذریعہ ہمدردان اردو اور تمام انجمنوں کے ذمہ داران کو توجہ دلائی ہے کہ اب تعلیمی ادارے کھل گئے ہیں اس لیے اپنے اپنے حلقوں میں بیسک جونیر اور سکنڈری اسکولوں میں اردو کے طلباء کو داخل کرائیں۔ سہ لسانی فارمولے میں متفقہ طور پر سنسکرت کی تعلیم روک دی گئی ہے اس لیے ایسے تمام طلباء کو جنھیں جبری سنسکرت پڑھائی جاتی تھی اردو پڑھنے کا موقع بہ آسانی مل گیا ہے۔ اس وقت تمام بہی خواہان اردو کو متحد ہو کر اردو کی تعلیم رائج کرانے میں جد و جہد کرنا چاہیے۔

(قومی آواز)

یو۔پی کے تین اور اضلاع میں اردو کے لیے سہولتیں

رامپور ۱۴ر جولائی۔ انفارمیشن آفیسر رامپور نے ایک پریس نوٹ میں کہا ہے کہ ان اضلاع میں جہاں اردو بولنے والوں کی تعداد ۱۵ فیصد ہے قوانین بائی لاز اور اہم سرکلر اردو زبان میں بھی شایع کیے جائیں گے۔ پریس نوٹ میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ میرٹھ، لکھنؤ اور نینی تال کو بھی پندرہ فیصدی اردو بولنے والے اضلاع میں شامل کر لیا گیا ہے۔

آخر میں کہا گیا ہے کہ اس سے پیشتر یہ رعایت رامپور، بجنور، بریلی، مرادآباد، سہارنپور اور مظفر نگر کو مل چکی ہے۔ (دعوت)

یو۔پی کے طلباء کی اکثریت تیسری زبان کی حیثیت سے سنسکرت چاہتی ہے

۴۲۹۵ طلباء نے تیسری زبان کی حیثیت سے اردو کی تعلیم حاصل کی

لکھنؤ ۱۹ر جولائی۔ ایک سرکاری ترجمان نے بتایا کہ یو۔پی میں ۱۹۶۴ء میں سہ لسانی فارمولا نافذ کیا گیا تھا جس کے تحت چھٹی ساتویں اور آٹھویں کلاسوں میں ہر طالب علم کے لیے ہندی، انگریزی اور کوئی ہندوستانی زبان پڑھنا ضروری تھی۔ اس سال تین لاکھ ۹۰ ہزار طلباء نے سنسکرت ۲۹ ہزار ۵۰۲ طلباء نے اردو ۳۹۹ طلباء نے پنجابی اور ۲۵۶۵ طلباء نے بنگالی کو تیسری زبان کی حیثیت سے پڑھا۔ اس سال حکومت نے مزید اساتذہ کے لیے تین لاکھ ۶۳ ہزار روپیے خرچ کیا تھا جب کہ اس سال (۱۹۶۶ء) میں ۲۵ لاکھ ۵۰ ہزار روپیہ خرچ کیا جائے گا۔ اگر کم سے کم پانچ طلبا کوئی ہندوستانی زبان تیسری زبان کی حیثیت سے پڑھنے پر راضی ہوں گے تو حکومت اس اسکول میں ان کے لیے استاد کا انتظام کرے گی۔ (دعوت)

"ہماری زبان" سے خط و کتابت کرتے وقت اپنے خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں

انجمن تعمیر اردو میں مولانا شاہد احمد دہلوی مدیر "ساقی" کا استقبال

دلی۔ ۲۰ جون۔ انجمن تعمیر اردو دہلی کے زیر اہتمام اتوار ۲۴ جون کو اردو ہال دلی میں جناب شاہد احمد دہلوی مدیر ماہنامہ "ساقی" کراچی کا شاندار استقبال ہوا۔ تقریباً سو اہل قلم شریک بزم تھے۔ لالہ شام ناتھ نائب وزیر ریلوے حکومت ہند، مسٹر مشتاق احمد صاحب صدر انجمن تعمیر اردو و صدر دلی پردیش کانگریس، پنڈت آنند موہن زتشی گلزار دہلوی جنرل سکریٹری انجمن ہذا اور شری جگن ناتھ آزاد نے استقبالیہ تقریریں فرمائیں اور دلی کی گزشتہ ۱۰ سالہ تاریخ کے ادبی گوشوں پر روشنی ڈالی اور مولانا شاہد احمد دہلوی کی ادبی خدمات کا اعتراف کیا۔ شاہد احمد دہلوی نے قدیم دلی پر ایک موثر تقریر کی اور تعمیر اردو کے کارکنوں کا شکریہ ادا کیا۔ اس موقع پر دہلی کے شعراء نے اپنا کلام بھی سنایا۔ (گلزار دہلوی سکریٹری)

بھوپال ریڈیو اسٹیشن پر اردو کا شعبہ علاحدہ قائم کیا جائے

بھوپال ۳ جولائی: "بھوپال گزشتہ ایک صدی سے شعر و ادب کا مرکز رہا ہے۔ عرصہ دراز تک سرکاری اور مقامی زبان ہونے کی وجہ سے اردو یہاں کے شاعروں اور ادیبوں کا ذریعہ اظہار رہی ہے۔ یہ بات کچھ کم فخر کی نہیں کہ بھوپال کے فن کار ہندستان کے شعر و ادب میں نمایاں مقام رکھتے ہیں" یہ الفاظ بھوپال میونسپل بورڈ کے چیرمین شری عبدالکریم نے اس سپاسنامہ میں کہے جو انھوں نے بھوپال کے شہریوں کی طرف سے مسز اندرا گاندھی کو پیش کیا تھا۔ انھوں نے مطالبہ کیا کہ بھوپال ریڈیو اسٹیشن میں اردو کا شعبہ الگ سے کھولا جائے۔ شری عبدالکریم نے بھوپال کے شہری مسائل کا جائزہ بھی لیا اور کہا کہ نئے بھوپال کے ساتھ پرانے بھوپال کی خصوصیات کو بھی نظر انداز نہ کیا جائے۔ سلیس اردو میں پیش کیے گئے اس سپاسنامہ میں انھوں نے مسز اندرا گاندھی کی خدمات کو بھی سراہا۔ مسز اندرا گاندھی نے تقریر اردو میں نہیں کی اور لسانی مسائل میں تنگ نظری کی مذمت کی۔ (قومی آواز، لکھنؤ)

بھوپال میں اردو ہال اور کتب خانہ کے قیام سے متعلق تجویز پیش

بھوپال۔ ۱۳ جولائی۔ انجمن ترقی اردو بھوپال کی مجلس عاملہ کا جلسہ جناب ایم عرفان کی صدارت میں ریاستی انجمن کے سکریٹری جناب اقتدار علی کے مکان پر ہوا۔ اس جلسہ میں ایم عرفان نے ایک دس نکاتی پروگرام پیش کیا جس کی سائیکلو اسٹائل کاپیاں اراکین کو پیش کی گئیں۔ اس میں بنیادی تنظیم اور فرائض، بزم ادب اور شبینہ مدارس کی تشکیل، اردو طالب علموں کے مسائل، داخلوں کے سلسلے میں سرپرستوں سے رابطہ، اردو ہال اور کتب خانہ کا قیام اور ممبران کی کارکردگی کے سلسلے میں تجاویز پیش کی گئیں اور اس میں طے پایا کہ یہ پروگرام آئندہ میٹنگ میں زیر بحث لایا جائے گا۔

اس جلسہ میں تین تجاویز منظور کی گئیں۔ ایک تجویز کے ذریعہ بھوپال شاخ کے سابق صدر جناب آفتاب الدین اور ممبران مجلس عاملہ کی خدمات کا اعتراف کیا گیا۔ اور بھوپال میں اردو کے بقا اور اس کی ترقی کے لیے ان کے قیمتی وقت دینے اور جدوجہد کرنے کے اعتراف کے ساتھ آئندہ بھی عملی تعاون جاری رکھنے کی اپیل کی گئی۔

ایک اور تجویز کے ذریعہ محکمۂ تعلیم کے اردو کے ساتھ طرز عمل کو غیر جمہوری اور غیر صحت مند بتاتے ہوئے مادری زبان میں تعلیم دینے کے دستوری حق پر عمل درآمد کرنے کے لیے ایک کمیٹی کے ذریعہ گورنر صاحب اور وزیر اعلیٰ، وزیر تعلیم کے سامنے اردو کا مقدمہ پیش کرنے اور اردو کے دستوری حق کے لیے مناسب کارروائی کا محاذ قرار دیا گیا۔ اس بات پر گہری تشویش کا اظہار کیا گیا کہ لسانی کمشنر کی ہدایات اور ایم۔ پی سرکار کے واضح احکامات کے باوجود بھوپال کے مدارس میں پرائمری سے لے کر ہائر سکنڈری کے درجات تک طلبا کو اردو میں ذریعۂ تعلیم کے حق سے محروم رکھا گیا ہے۔

ایک تجویز انجمن کے کام کو تیز کرنے اور والدین کو ان کے حقوق کے تحفظ کا احساس دلانے کے لیے انجمن کی حلقہ وار شاخیں تشکیل کرنے سے متعلق پاس کی گئی تاکہ ان کے تحت منظم جدوجہد سرکاری اور نیم سرکاری مدارس میں ذریعہ تعلیم کے طور پر اردو کو بھی رائج کرانے کی جدوجہد کا آغاز کیا جا سکے۔ مجلس عاملہ کے اس جلسہ میں ۱۷ میں سے ۱۰ اراکین بشمول صدر موجود تھے۔

مدرسہ فوقانیہ نسواں شکر نگر میں اردو کی گیارہویں جماعت کا قیام

غلام محمد مصطفیٰ ساغر حیدرآبادی معتمد ترقی اردو شاخ بودھن نے بیان دیا ہے کہ انجمن ہذا کی تحریک پر مدرسۂ فوقانیہ نسواں شکر نگر میں اردو کی گیارہویں جماعت کے قیام کی منظوری محکمۂ تعلیمات سے بذریعہ مراسلہ 393/K2/68 مورخہ ۲۰/۶/۱۹۶۸ء دی ہے جس کے لیے انجمن ہذا محکمۂ تعلیمات کی ممنون و مشکور ہے اور امید کرتی ہے کہ اس مدرسہ کی فوقانی جماعات کے لیے معلمات کا بھی جلد از جلد انتظام فرمایا جائے گا۔ نیز بذریعہ ہذا متذکرہ صدر مدرسہ کی جمیع طالبات اردو گیارہویں جماعت کو مسرت کے ساتھ اطلاع دی جاتی ہے کہ وہ فوری مدرسہ کی جانب رجوع ہو جائیں۔

(نامہ نگار)

تبصرہ

وحید اختر

نقشِ آذر

راشد آذر حیدرآباد کے ایک جواں فکر اور جواں سال شاعر ہیں، ان کا مجموعہ کلام حال ہی میں مکتبۂ صبا حیدرآباد نے شائع کیا ہے۔ اس مجموعہ کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ شاعر نے اپنے قلم اور اپنی شاعری پر اعتبار کرتے ہوئے کسی بڑے محقق یا نقاد سے کوئی تعارف، پیش لفظ یا مقدمہ لکھوا کر "سفارشی سرٹیفکٹ" کتاب کے ساتھ منسلک نہیں کیا، راشد آذر نے خود ہی اپنے فن کے متعلق لکھا اور اپنا تعارف کروایا ہے۔

راشد آذر ایسے ہی نئے شاعر ہے جس کی شاعرانہ عمر مختصر ہو اور جسے دوسری مصروفیات اور غمِ معاش پوری طرح شاعری کی طرف توجہ کرنے کی مہلت نہ دیں یہ توقع کرنا زیادتی ہوگی کہ وہ اپنے ابتدائی مجموعے ہی میں کوئی عظیم تخلیق کارنامہ پیش کر دے گا۔ یہی کیا کم ہے کہ کسی کے یہاں شاعری سے سچا لگاؤ، اپنی ذات اور اپنے ماحول سے خلوص اور اپنے فن کو نکھارنے کی لگن مل جائے۔

راشد آذر کے یہاں یہ تمام خوبیاں ملتی ہیں۔ راشد آذر عمر کے لحاظ سے بھی اور شاعری کی نوعیت کے لحاظ سے بھی ایک جدید شاعر ہیں اگرچہ وہ جدیدیت کے منفی میلان سے بیزار ہیں، پھر بھی ان کی شاعری میں زندگی کے حسن اور اس کے مستقبل پر یقین کے باوجود موجودہ معاشرے میں اقدار کی شکست و ریخت اور اس کے نتیجہ کے طور پر حزن، مایوسی اور تشکیک کی پرچھائیاں نظر آہی جاتی ہیں وہ جانے خود افسردگی کا احساس اور معاشرے کے خلاف غم و غصہ کوئی بری چیز نہیں بلکہ اکثر صورتوں میں یہی چیز محرکِ تحریر بن جاتی ہے، راشد آذر ان نئے شاعروں میں سے ہیں جو شاعری کے اجتماعی مقاصد اور افادیت کے قائل ہیں، لیکن بحیثیت مجموعی ان کی نظموں کا لب و لہجہ انفرادی، داخلی اور SUBJECTIVE ہے۔ "سوز کی عصمت" کے علاوہ شاید ان کی اور کوئی نظم سیاسی مسئلے پر نہیں ہے، باقی تمام نظموں کا موضوع فرد کی داخلی کشمکش، بچھلی یادیں، آئندہ زمانے کے خواب، عشقیہ تجربے، ہجر و وصال کی کیفیات اور غمِ ذات ہے۔ فرد اپنی ذات کے خلوت کدے میں بھی غمِ روزگار کی زنجیروں کو نہیں توڑ سکتا ابھی یہ راشد کی ذات میں چھپا ہوا شاعر اپنے ذاتی مسائل پر خود [illegible] انداز میں سوچتے ہوئے بھی اپنے اطراف بکھری اور پھیلی ہوئی زندگی کے مسائل کا، جو کسی وقت بھی اپنے دل و دماغ سے جھٹک نہیں سکا، ماحول کی یہ جبریت ہی راشد آذر کی شاعری کے اجتماعی شعور کی سمت متعین کرتی ہے، شاعری ان کے لیے اس دارالجدال میں گوشۂ عافیت بھی ہے اور مستقبل کی جنگ لڑنے کا ایک حربہ بھی۔

"چینی کی گڑیا" بظاہر ایک ذاتی نظم ہے، مگر نظم کی ابتدا ہی دیکھیے ؎

کیا جینے کا رول یہی ہے
ذہن کا اک آئینہ خانہ
اور یادوں کی چینی گڑیا
جس پر ان مٹ نقش بنے ہیں

یہ ابتدا ایک طرف جینے کی کوشش میں شاعر کے زخموں کا شمار بھی ہے اور بہتر زندگی گذارنے کے حوصلے کی آئینہ داری بھی اس نظم میں بہت خوبصورت IMAGES ملتے ہیں، راشد آذر کی نظموں میں ہم کو وہ نئی امیجری ملتی ہے جو آج کی شاعری اور آزادی سے پہلے کی جدید شاعری کے درمیان خطِ امتیاز کھینچتی ہے۔ راشد مصور بنتے بنتے شاعر بن گئے، مگر مصوری سے ان کا لگاؤ اب بھی باقی ہے جو ان کی نظموں میں نئے نئے IMAGES بڑی خوبی سے ڈھالتا ہے۔ راشد کی یہی خصوصیت ان کی انفرادیت کا تعین کرتی ہے۔ راشد کی انفرادیت میں خصوصیت بھی ہے، سادگی بھی اور بے ریائی و بے باکی بھی جس کا اندازہ اس نظم سے ہو سکتا ہے جو انھوں نے اپنے والد مرحوم پروفیسر حسین علی خاں کی یاد میں لکھی ہے جو لوگ حسین علی خاں صاحب کی شخصیت سے واقف ہیں انھیں اس نظم میں ایک زندہ اور منفرد شخصیت کے نقوش ملیں گے۔

راشد آذر کی شاعری کا لب و لہجہ رومانی ہے، ان کی فکر پر ادب کی ترقی پسند تحریک کا گہرا اثر ہے اور ان کے یہاں کہیں کہیں مغرب کی پرچھائیاں بھی نظر آئیں گی لیکن ایک نئے شاعر کے لیے دوسرے اثرات سے دامن چھڑانا اتنا آسان بھی نہیں۔ راشد آذر کے مجموعے کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے ذہن سے سوچتے ہیں، اور اپنے زمانے میں سانس لے رہے ہیں اس لیے یہ توقع کرنا بیکار نہ ہوگا کہ وہ جلد ہی اپنی انفرادیت کو نمایاں کر لیں گے۔ راشد کا کلام رسالوں میں کم شائع ہوا ہے اس لیے ان کا نام شاید نیا معلوم ہو لیکن "نقشِ آذر" کا مطالعہ پڑھنے والوں کو ایک اچھے اور خوش فکر نوجوان شاعر سے متعارف کراتا ہے جس کی کئی نظمیں اتنی موثر ہیں کہ ہم اسے بآسانی اپنے دور کے ابھرتے ہوئے شاعروں میں شمار کر سکتے ہیں۔

"نقشِ آذر" کی قیمت دو روپے ہے، اور یہ کتاب مکتبۂ صبا معظم جاہی مارکیٹ حیدرآباد سے مل سکتی ہے۔

مالک: انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ، پرنٹر ضمیر الدین قریشی نے مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ سے چھپوایا، پبلشر نذیر حسین نے دفتر مرکزی انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ سے شائع کیا